ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

اقصیٰ امیر
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد عالم خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

انور سجاد۔۔۔ جدید ناول نگاری کا نقشِ اول ("خوشیوں کا باغ" کے تناظر میں)

Aqsa Amir
Ph.D Scholar Department of Urdu Lahore Garrisson University Lahore.
Dr. Muhammad Alam Khan
Associate Professor, Department of Urdu, Lahore Garrison University, Lahore

Anwar Sajjad... The First Image of Mmodern Novels (In the context of "Khushion Ka Bagh"

Anwar Sajjad was renowned fiction writer in Urdu Literatue. He is considered trend setter in the Urdu short stories as well as Urdu Noval writer. In this essay, his famous noval "Khushion Ka Bagh" is being discussed in the perspective of modern fiction the traditiona modern fiction and it is elaborated that how milestone in the history of noval writing. It is also analysed the roal of Dr. Anwar Sajjad to create a new trend in the history of literature.
Key Words: *Renowed, Fiction, Urdu Literature, Trend, Short Stories.*

انیسویں صدی میں زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد بدلتے ہوئے رجحانات میں ہندوستان کی تاریخ نے ایک موڑ لیا۔ لوگوں نے اپنے رہن وسہن کے طریقے بدلے، عام لوگوں میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ لوگوں نے قدیم رسم ورواج سے انحراف کر کے مغربی طرز معاشرت کو اپنانا شروع کیا۔ نئی ذہنی اور ادبی فضا ساز گار ہوئی تو جدید تقاضوں نے پرانی روایات کو مسمار کر کے نئی سماجی قوتوں کی جگہ ہموار کی۔ غالب کی جدید نثر، سرسید کا تہذیب اخلاق، انجمن پنجاب کے مشاعرے اس تبدیلی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

اُردو ناول نگاری کا آغاز مغربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ اتنی قدیم نہیں ہے۔ تاہم اُردو فکشن داستانوں، حکایتوں، قصّوں سے ہوتا ہوا ناولوں تک آتے آتے مختلف مکتبہ فکر سے وابستہ رہا ہے اور موضوعاتی اعتبار سے سماج کی بدلتی ہوئی اشکال کے ساتھ ساتھ ناول بھی فکری خدو خال بدلتا رہا ہے۔

اس عہد کے ناول نگاروں نے سرسید کے فکری افکار کا اثر قبول کیا جو ان کی تحریروں میں غالب نظر آتا ہے۔ مولوی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، مرزا رسوا اور راشد الخیری نے ناول اسی تناظر میں سماج کی موجودہ اخلاقی اقدار اور بے بسی، گھٹن اور سماجی رویوں کو بہتر انداز میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

موضوعات اور رجحانات کے لحاظ سے اُردو ناول مختلف نشیب و فراز سے گزرتا ہوا وقت کے تقاضوں کے مطابق نئی راہ پر نہ صرف گامزن ہوا بلکہ یہ رجحانات لحمہ بہ لحمہ بدلتے رہے اور یہی معاشرے کے بہترین عکاس تھے اور مختلف فکری دھاروں کے لوگ اپنی پسند سے بلند ہو کر ان پیچیدہ اور نازک موضوعات کو بڑی جانفشانی سے بیان کرنے لگے۔

پاکستانی ادب میں غیر ملکی ادب سے استفادہ کرنے کا رجحان خاصا نمایاں ہے۔ خاص طور پر شاعری میں نظم نگاری، نظر میں افسانہ نگاری، ناول نگاری نے یہ اثرات زیادہ قبول کیے ہیں۔ غیر ملکی ادب کے اثرات علامتی اور تجریدی ناول میں خاصے مضبوط نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمیں انور سجاد کی صورت میں نظر آتی ہے۔

انور سجاد کثیر الجہت شخصیت ہیں، ڈاکٹر انور سجاد ایک بہترین ناول نگار، ترقی پسند مصنف اور ہمہ جہت فنکارانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ انھوں نے پرانی روایت سے ہٹ کر ناول کو نئے رجحانات سے روشناس کروایا مگر ان کی تخلیق میں ترقی پسند سوچ غالب ہے۔ پاکستان کی تشکیل سے لے کر مارشل لاء کے دوران شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کو اظہار رائے یا مافی الضمیر بیان کرنے کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑتی تھیں۔ ایسے حالات میں دانشور طبقے نے علامت کو اظہار کا وسیلہ بنا کر اپنے جذبات کی عکاسی کی اور اس کی ایک بہترین مثال انور ر سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر خالد اشرف اپنے مضمون "معاصر پاکستانی ناول ایک جائزہ" میں لکھتے ہیں:

> "۱۹۸۰ء تک آتے آتے پاکستان میں انسانی بحران کی شدت میں شاید اضافہ ہو گیا۔ دوسری طرف بنگلہ دیش کی تکلیف دہ علیحدگی اور بین الاقوامی منظر نامے میں پاکستان کی شکست خوردگی نے اُردو میں ایک نئی قسم کے ناول کی تحریر و تخلیق کی بنیاد قائم کی۔ انتظار حسین کا

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

"بستی"(۱۹۸۰ء)انیس ناگی کا "دیوار کے پیچھے" (۱۹۸۰ء)اور انور سجاد کا "خوشیوں کا باغ" (۱۹۸۱ء) تین ایسے اہم ناول تھے جن میں ۱۹۷۱ء کی ہزیمت اور ۱۹۷۷ء کے بعد کے عہد مارشل لاء کی پیدا کردہ گھٹن اور تنگ نظری کو غیر روایتی اور علامتی انداز میں پیش کیا گیا۔ ان ناولوں کے فکری اور فنی تجزیے سے جو نتیجہ بر آمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی تشکیل کے بعد سے پاکستانی ریاست، سیاست، معیشت اور معاشرت بتدریج زوال اور بحران کی گہرائیوں میں ڈوبتی جارہی ہے۔ ان ناولوں سے ملک کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں فرد کے لیے دینی، نفسیاتی و جذباتی طور پر آزادانہ زندگی بسر کرنے اور فطری طور پر نشو و نما حاصل کرنے کے مواقع محدود ہیں اور مذہب و کلچر کے نام پر ایک ایسا پر تشدد معاشرہ وجود میں آچکا ہے جہاں عام ڈگر سے ہٹ کر سوچ رکھنے والے شہریوں اور اقلیتی گروہوں کے ساتھ ناروا داری کا سلوک کیا جاتا ہے، پچھلی صدی کی آخری دہائی تک آتے آتے پاکستان ایک ایسی محبوس سوسائٹی بن چکا ہے جہاں برل ازم اور جدید طرز فکر کی روشنی کم ہی پہنچ پائی ہے۔"(۱)

زمینی خوشیوں کا باغ(The Garden of Delights)بوش(۱۴۵۰۔۱۵۱۶) کی تصویر ہے۔"حوا کی تخلیق"، "خوشیوں کا باغ" اور "موسیقی کا جنم" اس کے تین پینل ہیں۔ "حوا کی تخلیق" اور "خوشیوں کا باغ" میں جو اس کی لذتوں یا جنس و ہوس کی عکاسی کی گئی ہے۔ تیسرے پینل میں "موسیقی کا جنم" میں گناہوں کی پاداش کا عبرت ناک ماجرا ہے۔

"خوشیوں کا باغ" انور سجاد کا اہم ناول ہے، اس ناول کا ابتدائی جملہ اس کے موضوع کا تعین کر دیتا ہے۔

"بوش کے خوشیوں کے باغ کا ہر پینل ایک دنیا ہے اور تیسرا پینل تیسری دنیا۔"(۲)

ڈاکٹر انور سجاد نے "خوشیوں کا باغ" باش کی تصویر-----"The Garden of Delights" کے پس منظر میں قلمبند کیا ہے۔ پندرہویں، سولہویں صدی کے مصور نے اپنے عہد کی بنیاد پرستی کی روح کو اپنی تصویر میں مجسم کر دیا تھا۔ اس تصویر کے تین پینل ہیں۔ "حوا کی پیدائش"، "خوشیوں کا باغ" اور "موسیقی کا جنم"---۔ ناول نگار نے ہر پینل کو ایک دنیا اور تیسرے پینل کو تیسری دنیا تصور کیا ہے۔ یوں مصنف نے قدامت پرستی کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ اس نے ساحل سمندر پر ساکت کشتی کو دکھا کر سوال اٹھایا ہے۔ کوئی تو کشتی بنانے والا ہو گا؟

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

اس نے کشتی کیوں بنائی؟ کوئی تو مقصد اس کے پیشِ نظر ہو گا؟ پھر بیان ہوتا ہے کہ عوام کے سچے دوست نے عوام کے تعاون سے کشتی بنائی تھی کہ تیسری دنیا کے لوگوں کی کھالیں اتار کر آدم خور اپنے جزیرے میں لے گئے تھے۔ کشتی تیار ہوئی، بادبان پھڑ پھڑائے اور مظلوم اپنے قائد کی قیادت میں آدم خور جزیرے کا رُخ کرنے لگے۔ آدم خوروں کے مسلح گماشتوں نے قائد کو محصور کیا اور کشتی کو صلیب کا اسلوب دیا۔ مقامی اہل زر نے مٹھائیاں تقسیم کیں کہ وہ بچ گئے، لوٹ کا مال بچ گیا۔ عوام کے گھر آگ کی لپٹوں کا منظر پیش کرنے لگے۔ یہ لپٹیں سلاخیں نظر آنے لگیں۔ باشعور لوگ جانتے تھے کہ یہ آگ کی لپٹیں ہیں نہ سلاخیں۔۔۔۔ یہ تو اندھیرا ہے جس میں کوئی کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔ اپنے آپ کو بھی نہیں یوں سب ہار کے بکھرے دانوں کی طرح گمشدہ ہیں۔ افراد ریزہ ریزہ ہیں اور سماج بے شعور ریوڑ۔

عوام کے پاس نجات دہندہ کا تصور ہے اور انتظار، شعور بھی ہے اور جمود بھی کب کوئی ان کی بے حسی ختم کرے وہ کشتی میں سوار ہوں اور آدم خور جزیروں میں پہنچیں اور آدم خوروں کے قبضے سے اپنی کھال بر آمد کریں۔ عوام کو اسی بات کا انتظار ہے۔ کب بے حسی کی زنجیریں ٹوٹیں گی اور بے زبان عوام کو رہائی نصیب ہو گی۔ کبھی تو ہو گی۔۔۔ یہی آس ہے پھر نظام زر میں جکڑے ہیرو کو اپنی معمول کی زندگی سے باہر، ایک ہیروئن ملتی ہے۔ وہ خود کو روایت کے بندھنوں سے آزاد کرتی ہے اور دیکھتی ہے کہ عوام، دیسی بدیسی کھال اتارنے والے قصابوں کے گھیراؤ کی غرض سے شاہراہوں اور چوراہوں پر نکل آئے ہیں۔ وہ انھیں للکار رہے ہیں۔ یہ عورت بھی اس للکار میں شامل ہو جاتی ہے، نتیجہ گرفتاری ہے۔ ہیرو، جو زیرو کی مانند محض ایک فرضی نکتہ تھا، اپنے خول سے باہر آکر خود کو دیکھتا ہے۔ وہ بھی حقیقت ہے فرضی وجود نہیں۔ سو لاشعوری طور پر نظام زر کا یہ مہرہ، چیف اکاؤنٹینٹ اپنا حقیقی وجود پا کر زرداروں کے مفاد کے خلاف کام کر بیٹھتا ہے۔ یوں اسے بھی عوام کے ساتھ سڑکوں پر پھینک دیا جاتا ہے۔ عوامی جدوجہد میں شمولیت سے اس میں تنہائی اور بے بسی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ جدوجہد میں پسِ دیوار زنداں ہی اسے آزادی سے ہمکنار ہونے کا موقع ملتا ہے۔

پہلی دنیا اور دوسری دنیا جہانِ مغرب ہے جہاں گناہ ہوتے ہیں جبکہ سزا تیسری والے بھگت رہے ہیں۔ اہلِ مغرب آزاد اور اہلِ مشرق غلام ہیں۔

> "تیسری دنیا کے نو آزاد ملکوں کے لیے بین الاقوامی اقتصادی ماحول اس وقت بھی معاندانہ تھا جب انھیں خود مختار مملکت کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن ان کی سیاسی آزادی کے عشروں

کے دوران ان کے اور مالدار ملکوں کے درمیان اقتصادی ناہمواری حد سے بڑھ گئی ہے۔ قحط، بھوک، ادائیگیوں کے توازن میں مزمن خسارے، تجارت کی بدتر شرائط، جب ان میں سے کوئی ان بے انصافیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ آپ اور آپ کے ملک کو برباد کر دیا جائے گا۔"(۳)

تیسری دنیا کے لوگ اپنے مقدر کی تلاش میں آدم خوروں کے جزیرے میں جانا چاہتے ہیں۔ اپنے قائد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے کشتی بنالی ہے لیکن اسے ابھی پوری طرح سمندر میں اتار نہیں پائے کیونکہ آدم خوروں نے مسلح گماشتوں کے ذریعے سے کشتی کے بادبانوں اور مستول کو عظیم قائد کی صلیب بنا دیا ہے۔ سو اہل زر بچ گئے۔

"اپنے جسموں پر اپنے مقدر کی کھال کو براسو مارتے خوش ہیں کہ بچ گئے۔ مٹھائیاں بانٹتے ہیں کہ اس سے ان کا پیچھا چھوٹ گیا جو انھیں عظیم مقدر کا چکر دے کر، ان کی کھال ادھیڑنا چاہتا ہے۔ سب کچھ جو انھوں نے باقی سمتوں سے چھین کر، اپنے جسموں پر پہنا ہے۔ وہ اپنے جسموں کو براسو سے چمکاتے ہیں اور اپنے محافظوں کی زرہ بکتریں، نیزے بھالے۔ بھی لشکاتے ہیں کہ ایک دوسرے کی پٹنک میں ایک دوسرے کی شناخت قائم رہے۔"(۴)

اہل زر نے عالمی سطح پر نظام زر وضع کیا ہے۔ اپنے مفاد میں عوام کو قانون کے جال میں پھنسایا ہے۔ سب محصور ہیں کہ ان کی محنت کی کمائی، ان کے جسموں کی کھال اتاری جا سکے۔ لوگ حصار در حصار قید میں ہیں جو اہل زر کو لوٹنے کے اہل ہیں۔ انھیں کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے جبکہ قید کرنے والے ہی کال کاٹھڑی میں بند ہونے چاہئیں۔ اہل زر کو ظالمانہ نظام ہی میں تحفظ محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے عوام کے عظیم مقدر کو ظلم، جہالت اور جبر کے اندھیروں میں گم کر دیا ہے۔

"قید بامشقت، کوڑے یا سزائے موت سے جرائم کم نہیں ہوتے ہر قسم کے جراثیم کو ختم کرنے کا صرف طریقہ یہ ہے کہ بڑے کی بڑائی اور چھوٹے کی چھوٹائی کو بیک وقت ختم کر دیا جائے۔ پھر دراضی کے معمولی تقاضے سے لے کر تیسری عالمگیر جنگ تک کوئی قتل نہ ہو گا۔"(۵)

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" اپنے تجربے کے اعتبار سے معمولی سی تبدیلی کا اعلان کرتا ہوا دنیائے ادب میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں مرکزی کردار کا کوئی نام نہیں ہے۔ صرف اسے "میں" کے نام سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ "میں" تیسری دنیا کے ایک ایسے ملک کا شہری ہے جو مذہبی اور نظریاتی بنیادوں پر قائم تھا لیکن یہ مذہب کے گورکھ دھندوں اور سیاست کی بدعنوانیوں اور جبر و تشدد کے ہاتھوں ظلم و بربریت، لوٹ کھسوٹ اور استحصال کی آماجگاہ بن چکا ہے اور "میں" جیسے بے شمار حساس اور باشعور افراد اس ظلم و جبر اور ذلت و کرب کو جھیلنے کے لیے مجبور ہیں۔ "میں" اپنے گھر کے چاروں طرف دولت اور آسائشوں کی ریل پیل دیکھتا ہے لیکن پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہونے اور زندگی میں مکمل رچاؤ ہونے کے باوجود جسم میں چیونٹیاں کیوں رینگتی محسوس ہوتی ہیں۔

خالد اشرف اس کے استعجاب کی وجہ تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "دراصل "میں" کی روح لالچ ہوس اور دولت کی ریل پیل کے اس ماحول میں گھٹ کر رہ گئی ہے کیونکہ وہ ذکی الحس فرد ہے۔ اس لیے تنہائی اور کرب کا شکار ہے۔ وہ اس انسان دشمن اور بشریت کُش سماج میں صرف جبلتوں کے سہارے زندہ ہے کیونکہ وہ اعلیٰ طبقے کی ہوسِ زر، ضمیر فروشی اور کمزور طبقوں کو کچلنے کی سازش کا چشم دید گواہ ہے وہ جانتا ہے کہ بین الاقوامی ملٹی انڈسٹریل طاقتوں کے دلال جو بر سر اقتدار ہیں، بے بس و ناخواندہ عوام کو کس طرح گروی رکھ کر اپنی خوشحالی اور تحفظ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ "میں" امن و سکون کا طلب گار ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ کیا کمزور کا امن طاقتور کے امن سے مختلف ہے لیکن وہ ترسیل کے المیے کا شکار ہے۔" (۶)

"میں" کا کردار ہر طرح کی مادی سہولیات کے باوجود اپنی ماں اور بچی کے ساتھ خوف کے سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی حساس طبیعت اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے متاثر ہو رہی ہے۔ وہ اور اس کی بیوی کے ازدواجی تعلقات خاصے اچھے نہیں ہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اس نے ایک داشتہ رکھی ہوئی ہے جسے وہ باقاعدگی سے ایک معقول معاوضہ ادا کرتا ہے اور اس کی بیوی کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشیدگی اتنا طول پکڑ لیتی ہے اور وہ اسے دوسرا مرد تلاش کرنے کو کہہ دیتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ اس کی ماں کی موت اور بیوی کا حمل ضائع ہونے کا صدمہ اس کے ذہنی دباؤ کا باعث بنتا ہے اور ذہنی تناؤ کا شکار نظر آتا ہے۔ اسی ذہنی دباؤ سے وہ انکم ٹیکس گوشواروں میں غلطی کا مرتکب نظر آتا ہے اور اسے برطرف ہونا پڑتا ہے۔ "خوشیوں کا باغ" میں اس بات

کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے سماج میں کمزور انسان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اصل طاقت جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ چھوٹے ممالک معاشرتی اور اقتصادی طور پر ایٹمی پاور ممالک کی بربریت کا شکار ہو رہے ہیں۔ اصل میں "میں" کے کردار کو لے کر کہانی نہیں بلکہ تیسری دنیا جس ظلم و بربریت کا شکار ہے اس کو ایک انداز سے دنیا کے سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔ "میں" مادی آسائشوں اور سہولتوں کے باوجود تمام رشتوں سے دور جا چکا ہے۔

"مجھے باندھ دو اپنی آنکھوں کی سرخی سے وہ سانس کہ جس میں زمین کی ناف کے ساتھ ساتھ ہجوم کے پسینے کی خوشبوں اور نعرے میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوئے تھے پوری قوت سے باہر نکالتا ہوں۔ سمندر پر فضا جامد سمندر کو لوٹتے سمندری پرندے کے حلق میں جمی چیخ۔۔۔ اب مجھے پتہ معلوم نہیں، میں ہجوم کے کس حصہ میں ہوں۔ نہ مجھے اس کی پرواہ ہے، اب صفر نہیں تنہا، بے کار مہمل بلکہ ان گنت صفروں میں ہوں۔"(۷)

"میں" اس لالچی ہوس اور دولت کے پوجاری ماحول سے اس قدر غیر مطمئن ہے کہ اس کو یہ سماج انسانیت کا دشمن نظر آتا ہے۔ اس صورتحال میں "میں" مسلسل تناؤ اور ذہنی دباؤ کا شکار ہے جہاں کوئی بھی انسان اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے سے گریز کرتا ہے۔ کسی بھی حساس شہری کی زندگی بے مقصد معلوم ہوتی ہے اور لفظوں کی حرمت ختم ہو چکی ہے۔ لفظوں کی حرمت کا ختم ہونے کا مقصد انسانیت کا جذبات سے عاری ہونا مفقود ہے۔ ان حالات میں ہمارا سماج عدم مساوات اور بے راہ روی کا شکار ہو چکا ہے۔ مگر "میں" کے دل میں یہ خواہش انگڑائی لے رہی ہے کہ وہ لفظوں کی قوت کو دریافت کرے اور لفظوں کو بادلوں کی گرج میں ڈھالے۔

"میں لفظوں کی قوت دریافت کرنا چاہتا ہوں میں کہنا چاہتا ہوں پھول۔۔۔ پتے، شبنم۔۔۔ میں کہنا چاہتا ہوں۔۔۔ طوفان۔۔ میں کہنا چاہتا ہوں شبنم۔۔۔ سمندر۔۔۔ طوفان۔۔۔ میں بارش میں بھیگ جانا چاہتا ہوں۔ میں لفظوں کو بادلوں کی گرج میں ڈھالنا چاہتا ہوں۔"(۸)

پاکستان ایک فلاحی ریاست ہے اس کی بنیاد اسلام کے نام پر رکھی گئی ہے۔ حضرت علی نے حق پرستوں اور حریت پسندوں کی طرف سے تیسری دنیا کے استحصال اور ظلم و بربریت کے خلاف جس عزم کا ارادہ کیا ہے اس میں امید کی کرن جھلکتی ہے۔ پیغمبروں، انسان دوست فلسفیوں، شاعروں نے جس دنیا کا تصور دیا ہے بالآخر انسان کی جہد مسلسل سے حقیقت بن جائے گا اور دنیا سے تمام دکھ و غم مٹ جائیں گے اور یہ دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی۔

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

"مدینۃ العلوم کے باب، دامادِ رسول ابوالحسنین سیدنا علی ابن ابو طالب کا ارشاد ہے کہ خود کو دوسروں کی غلامی میں نہ دو کہ تمہارے رب نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے سرکارِ دوعالم ﷺ کا مشن حق ہے، باقی سب باطل۔ حق و باطل کی جنگ زمانوں سے جاری ہے اور تب تک جاری رہے گی جب تک ایک بھی یزید لعین باقی ہے۔ جناب امام کے لہو رشتے قدموں کے نقوش ان راہوں پر چلنے والوں کے لیے نشان بن کر ہمیشہ تازہ رہیں گے۔ اس راہ میں سروں سے چادریں بھی کھینچ لی جاتی ہیں اور خیمے بھی لوٹ لیے جاتے ہیں۔ پابہ زنجیر بھی کر دیا جاتا ہے اور سر بھی قلم کر دیئے جاتے ہیں۔"(۹)

اس ناول کے مکالمے اس قدر جان دار ہیں کہ قاری اس میں کھو جاتا ہے ایسے لگتا ہے کہ جیسے ناول نگار اسٹیج پر کھڑے ہو کر مکالمے ادا کر رہے ہیں۔ "خوشیوں کا باغ" میں بے شمار اقتباسات ہیں جو ہمارے سامنے ایسی صورتحال پیدا کرتے ہیں کہ جیسے انور سجاد کے اندر کا اداکار ہمارے سامنے نکل آیا ہے۔

ذیل کا اقتباس دیکھیے۔

"تو کہاں ہے؟

ہم تیرا انتظار کرتے ہیں۔

امام مہدی ہمارے جسموں کا پانی ختم ہوتا ہے

مسیح موعودؑ ہمارے معدوں میں خلا بھرتے ہیں۔"

گوڈو ہمیں ہماری کشتی تک لے جا، بادبان کھول، رسیاں تھام تو آتا کیوں نہیں؟ دن ڈوبتا کیوں نہیں؟ سورج نکلتا کیوں نہیں؟"(۱۰)

ترسیل میں دقت ہی ہے جو ناول نگار کو علامتی و تجریدی اسلوب اپنانے پر اکساتا ہے۔ ترسیل وابلاغ کی یہ کمی قاری کو الجھن میں ڈالتی ہے۔ واقعات کی کمی کے باعث قاری کی دلچسپی مفقود نظر آتی ہے اور ناول کی یہ پیچیدگی ناول کی تفہیم میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ یہ انشائیہ ہونے کا شبہ دیتا ہے جو اسلوب کو پیچیدہ کرتا ہے۔ اس کا اسلوب بیانیہ اسلوب سے مختلف ہے کیونکہ یہ روایتی اسلوب سے ہی نہیں لکھا گیا بلکہ اس کے اسلوب کی کئی جہتیں ہوں گی۔ انور سجاد نے ناول میں شعور کی رو تکنیک کا استعمال بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنی تصنیف "آزادی کے بعد اُردو ناول، ہیئت، اسالیب اور رجحانات" میں "خوشیوں کا باغ" کے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

"خوشیوں کا باغ محض ایک سو چوبیں صفحات پر مشتمل ناول ہے جس کے کینوس کو ماجرے کے لحاظ سے انور سجاد نے تیسری دنیا تک توسیع دینے کی فنی طور پر کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں مونتاژ کی تکنیک کے ساتھ ساتھ رمزیہ، استعاراتی، علامتی پیٹرن اور خود کلامیوں کا ملغوبہ ملتا ہے۔ ان کی زبان بھی شاعری سے قریب تر آتی محسوس ہوتی ہے لیکن چونکہ ناول میں واقعات کی کمی، خیال و فکر کی کارفرمائی، مدھم ترین ایکشن اور تبصروں اور بیانیہ کی فراوانی پائی جاتی ہے جس سے ان کے اسلوب سے دلچسپی کا عنصر خارج ہو گیا ہے۔ یہ انشائیہ نما ہونے کا دھوکہ دیتا ہے۔ یوں ان کے یہاں پیچیدہ اسلوب کار فرما نظر آتا ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے "خوشیوں کا باغ" کے فنی تجزیے کے بعد مثالوں کے ذریعے انور سجاد کے اسلوب کی وضاحت کی ہے۔

"آسمان جس سے تاریکی اڈتی ہے لیکن دن کی لپٹیں اسے چاٹ لیتی ہیں۔ سمندر، لامتناہی کہیں رات کی تاریکی کا عکس، کہیں بھڑکتے دن کا آئینہ روشن اور کشتی جس کا اگلا دھڑ ساحل کے سینے پر ساکت ہے۔ تھیا، تھیا، تھیا، تھیا، مجھے خود پر اختیار نہیں رہتا۔ میں بے قابو ہو کر ناچنے لگتا ہوں۔ میرے جسم کا ریشہ ریشہ تڑپتا ہے ناچو، درون رامی رقصم، میں ناچتا ہوں، ناچتا ہوں، تھال میں کٹا ہوا سر۔"(۱۲)

انور سجاد اظہار کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں سے ہٹ کر ناول میں حقیقت نگاری، مقصدیت، تلازمہ خیال اور تبصروں کو ملا کر پیش کیا ہے۔ اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور سجاد قارئین سے کیا توقع رکھتے ہیں اور اپنی اس تخلیق کے حوالے سے کیا کہتے ہیں:

"میں فنی تجربوں کو بہت مستحسن تصور کرتا ہوں، اس سے نئے امکانات کو پالینے میں مدد ملتی ہے۔ بعض حالات میں تجربہ برائے تجربہ کا بھی قائل ہوں لیکن فنی تجربات میرے لیے ذاتی مشق کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک میں ان تجربات سے قائل ہو کر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر لیتا تب تک کہانی مجھ تک محدود رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے جو اپنے فنی تجربے کو یوں نہیں پرکھتا خود بھی کنفیوژن کا شکار ہوتا ہے۔"(۱۳)

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

انور سجاد تجربہ پسند ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول کے مطالعہ کے لیے قاری سے کچھ توقعات وابستہ ہیں اور ہر قاری ان کی تحریر سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ ناول کی تفہیم ریاضت کی متقاضی ہے۔ انور سجاد نے نئے پن کے لیے استعارے کو تجریدی صورت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی "خوشیوں کا باغ" کی تفہیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "وہ استعاروں میں سوچتا ہے اور استعاروں کے ذریعے اظہار کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کہانیوں میں تجرید کا عنصر نمایاں ہے اسی لیے عام قاری کے لیے بعض اوقاف افہام میں دقت پیش آتی ہے۔"(۱۴)

انور سجاد نے تیسری دنیا کے ممالک کی سیاسی و سماجی صورتحال کا استعارہ بنایا ہے۔ بوش کی تصویر نے انور سجاد کے لیے تحریک کا کام کیا اور یہ تحریک ان کو ایک نئی معنویت تک لے جانے کا باعث بنی۔ انھوں نے اس میں اپنی تکنیک کے مطابق ناول کی کہانی کو ٹکروں میں تقسیم کیا ہے۔ ناول میں "میں" کی ذاتی زندگی کی کہانی اور سماجی استحصالی، بے انصافی، اضطراب اور فسطائیت وغیرہ کے الگ حصے ہیں۔ اس لیے یہ غیر مربوط نظر آتا ہے۔ انھوں نے ناول کے تھیم پر توجہ دینے دینے کی بجائے شاعرانہ اور جذباتی نثر لکھنے پر اپنا وقت صرف کیا۔

ڈاکٹر انیس ناگی لکھتے ہیں:

> "انور سجاد کے دوسرے ناول "خوشیوں کا باغ" کو تجرباتی ناول کہا جاتا ہے کہ اس میں ناول کے روایتی فارمیٹ سے انحراف کر کے رومانوی اور شاعرانہ زبان کے ذریعے معنی کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ ایک بے نام اکاؤنٹنٹ کی داستان ہے جو معاشرتی اور انفرادی ناخوشی کا شکار ہے۔ وہ اپنی بیوی سے رنجیدہ ہے، اسے اپنی ماں کے مرنے کا کوئی دکھ نہیں۔ وہ کلبوں میں وہسکی پیتے ہوئے انقلاب کا خواب دیکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ناول میں تیسری دنیا کے اضطراب اور فسطائیت کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا انجام غیر متوقع طور پر صوفیانہ رقص پر ہوتا ہے۔ انور سجاد کے نزدیک یہ تیسری دنیا کا حال ہے فنی اعتبار سے اس ناول کو ٹکڑوں میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے غیر مربوط ہے۔ انور سجاد نے ناول کے تھیم پر توجہ دینے کی بجائے شاعرانہ اور جذباتی نثر لکھنے کو ترجیح دی ہے۔"(۱۵)

بلراج کومل "خوشیوں کے باغ" میں خوشیوں سے محروم بے بسی اور گھٹن معاشرے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"انور سجاد کا "خوشیوں کا باغ" ہے لیکن ان تمام خوشیوں سے محروم ہے جو کردار اور واقعہ کی آمیزش سے جنم لیتی ہے۔"(۱۶)

اس ناول میں انور سجاد نے ایک فرد یا ایک گروہ کی تاریخ کو بیان نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے سماج اور تمام انسانیت کی نفسیاتی کشمکش اور بے اطمینانی کی کتھا ہے۔ اصل میں ناول نگار نے آمریت اور جمہوریت دونوں کے چہروں پر جو نقاب ہیں ان کو ظاہر کرنے کے لیے یہ ناول تحریر کیا ہے کہ کیسے یہ لوگ مختلف روپ دھار کر انسان کی آزادی کو سلب کر دیتے ہیں اور عام آدمی روٹی کے لیے کیسے ان کی غلامی کو قبول کرتا ہے اور اپنی معمولی معمولی خواہشات کی تکمیل کے لیے خود کو غلامی میں دے دیتا ہے لیکن انور سجاد اس ساری صورتحال سے خوف زدہ نہیں بلکہ پُرامید ہیں کہ ہمارے اسلامی منشور کے مطابق یہ دنیا کبھی تو اس دلدل سے باہر نکلے گی۔

انور سجاد کا یہ ناول تیسری دنیا میں معاشرتی، سماجی، فکری اور معاشی بحران کا عکاس ہے اور یہ کہنا مناسب ہو گا کہ ان کا یہ ناول بہت حد تک ترقی پسند افکار کے زیر اثر تخلیق کیا گیا ہے۔ ان کا موضوعاتی اظہار من و عن ترقی پسند ناول نگاروں سے مماثلت رکھتا ہے اور ترقی پسند تحریک ان تصورات کو اجاگر کرتا ہے جو معاشرے میں اس بغاوت اور مساوات کے حقوق کی ترجمانی کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انور سجاد، ڈاکٹر، خوشیوں کا باغ، قوسین، لاہور: ۱۹۸۱ء ص ۱۵
۲۔ ایضاً: ص: ۳۰
۳۔ ایضاً: ص: ۱۷
۴۔ ایضاً: ص: ۲۱
۵۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اُردو ناول، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء، ص: ۸۷
۶۔ انور سجاد، ڈاکٹر، خوشیوں کا باغ، قوسین، لاہور: ۱۹۸۱ء ص ۲۹
۷۔ ایضاً: ص ۱۲۱
۸۔ ایضاً: ص: ۲۱

ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN(Online) : 2709-9644 | ISSN-L : 2709-9636

۹۔ ایضاً: ص:۴۷

۱۰۔ ایضاً: ص:۵۴

۱۱۔ ایضاً: ص:۲۰

۱۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول ہیئت ، اسالیب اور رجحانات، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، جلد دوم،۲۰۰۸ء، ص:۱۲۱

۱۳۔ ایضاً: ص۱۲۱

۱۴۔ انور سجاد، تلاش وجود، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۴ء، ص:۱۳

۱۵۔ انیس ناگی، تصورات، لاہور: جمالیات، س ن، ص:۱۶۳

۱۶۔ انیس ناگی، پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ، لاہور:، جمالیات،۲۰۰۴ء، ص:۲۴۵